سوانح عمری

۸۴

فہرست مضامین

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ بشیر پاشا مرحوم
بی اے بی ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی
تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیلِ تعلیم
کرکے اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے اُن مشاہیرِ قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنھوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہی اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہی۔ اعظم الرّجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شایع کئے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہی کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں اُن کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں۔

چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں اُن
عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں
اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالےٰ
ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے

میں اپنے پر جوش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کا جو بمبئی
میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے
نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے
بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت
میں ہماری مدد کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد الطاف حسین بی اے

ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنریبل جسٹس سید محمود بیرسٹر و سکرٹری محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ

(۱)

سرسید مرحوم کے فرزند اصغر سید محمود ۲۴ مئی سنہ ۱۸۵۰ء مطابق ۱۱ رجب ۱۲۶۶ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائً قدیم طرز پر قدیم اساتذہ سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور اسی زمانہ میں فارسی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہوگئی جو آخر تک قایم رہی۔

انھوں نے انگریزی ابتدائی تعلیم خانگی طور پر اور پھر مراد آباد اور غازی پور کے مدارس[1] میں حاصل کی ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ نے اضلاع شمال و مغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن میں تعلیم پانے کے لیے منتخب کیا۔ اور وہ سرکاری وظیفہ لیکر سر سید کے ساتھ اپریل کے مہینہ میں انگلستان روانہ ہو گئے۔

سر سید کے مقاصد سفر میں یہ ایک اہم مقصد بھی تھا کہ تعلیم و تربیت کے اُن طریقوں سے واقفیت حاصل ہو جن سے انگلش قوم نے ایسی اعلیٰ درجہ کی ترقی پائی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے مسئلہ تعلیم کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ وہاں کے تعلیمی طریقوں کو غور کے ساتھ مشاہدہ کیا اور ہندوستان میں ایک قومی دار العلوم قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس کے متعلق تمام تجاویز کا خاکہ بنا لیا۔ حتیٰ کہ جس نقشہ پر کالج کی عمارات تعمیر ہوئیں وہیں اس کو بھی لندن ہی میں اُنھوں نے تیار کیا تھا۔

---

[1] ان مدارس کو سر سید نے غدر کے بعد ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۴ء میں قائم کیا تھا۔ ان مدارس میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو عربی۔ فارسی کی بھی کلاسیں تھیں اور آخرالذکر میں سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

سرسید کے لیے اس موقع پر انگریزی نہ جاننے کے سبب سے مشکل و دقت تھی مگر سید محمود نے اپنا تمام وقت اپنے نامور باپ کو واقفیتوں اور اطلاعوں کے بہم پہنچانے میں صرف کیا۔ خود سرسید نے اپنے لیکچر میں جو انہوں نے ۱۸۸۹ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ علیگڑھ میں مدرستہ العلوم کے تاریخانہ حالات پر دیا تھا اس امداد کا اس طرح اعتراف کیا ہے کہ :-

"میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سید محمود کا نہایت شکرگذار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو مجھکو حاصل ہوئیں اُس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی۔ مجھکو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر اُن کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا۔ مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقہ کی جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آیندہ چلے گا اُن کی نسبت یہ کہنا کہ میں اُن کا تجویز کرنیوالا اور قرار دینے والا تھا ایک ناانصافی ہوگی بلکہ صاف کہنا چاہیئے کہ اُس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا جو انہوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لایق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا"

سرسید نے ان تجاویز میں جو تعلیم انگریزی کی اشاعت کے متعلق تھیں

یہ تجویز بھی کی تھی کہ ہندوستان پہنچکر خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یورپین سینس اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اُس میں اُن کو کیا اندیشہ ہے" نیز ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جائے۔ اس کمیٹی کا اشتہار[ل] اور وہ مضمون جس کا جواب مطلوب تھا سید محمود نے ہی لکھا تھا اور اُن ہی کا مجوزہ تھا۔

جب تک سر سید لندن میں مقیم رہے سید محمود نے ان ہی کے ساتھ قیام رکھا۔ سر سید کی واپسی کے بعد ستمبر ۱۸۶۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اُنھوں نے پہلی ہی مرتبہ کرائسٹ کالج لندن کے عام امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی اور تمام طلبا میں دسواں نمبر رہا اور خاص انگریزی زباندانی میں تمام کالج میں صرف ایک اور طالب عِلم اِس قابل نکلا کہ اُس کے اور سید محمود کے جواب برابر وقعت کے تھے اس لیے دونوں اول نمبر میں کامیاب ہوئے باقی تمام طلبا رہے جن میں زیادہ تر انگریزی تھے وہ فائق رہے۔

نومبر ۱۸۷۱ء میں اُنھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر کے مراجعت کی۔ اس خوشی میں سر سید نے بنارس میں ایک بڑا ڈنر دیا جو اپنی نوعیت کا پہلا ڈنر تھا۔

[ل] ۱۸۷۰ء میں قائم ہوئی جس نے "ایک التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند در باب ترقی مسلمانان" اور انعامی اشتہار شائع کیا تھا۔

جس میں عیسائی اور مسلمان دونوں نے ایک ہی میز پر کھانا کھایا۔

(۲)

جب تک سید محمود انگلستان میں تعلیم پاتے رہے، سرسید نے ان تجاویز تعلیمی کے بہت سے مرحلوں کو ہندوستان میں طے کر لیا تھا۔ سید محمود کو لندن میں ان کارروائیوں کی اطلاع ہوتی رہتی تھی۔ جب اس امر کی اطلاع ہوئی کہ مجلس خزینۃ البضاعۃ[1] لتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین نے بعد تحقیقات اسباب موانع ترقی تعلیم یہ قرار دے لیا ہے کہ ایک خاص مدرسہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بنایا جائے جس میں مسلمانوں کے مناسبِ حال تعلیم ہو اور اُن کو بھی اس مجلس کا ممبر مقرر کیا گیا ہے تو انہوں نے اس نظر سے وہاں کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو دیکھا اور اپنے قابل دوستوں سے مشورے حاصل کیے اور پھر اس مجوزہ مدرسہ کی ایک اسکیم مرتب کی جس کو واپسی کے بعد خزینۃ البضاعۃ کے اجلاس منعقدہ ۱۰ فروری ۱۸۷۲ء میں پیش کیا جس کی تمہید میں انہوں نے لکھا تھا۔

"قبل اس کے کہ میں اپنی رائے طریق تعلیم پر جو مجوزہ مدرسۃ العلوم میں ہونا چاہیے بیان کروں کمیٹی کو اس کے نام کی طرف توجہ دلانے کی آرزو رکھتا ہوں

---

[1] ۱۸۷۲ء میں بمقام بنارس قائم ہوئی تھی۔

جس میں ایک لفظ میں سمجھتا ہوں کہ سہواً داخل ہوا ہے۔ اس کمیٹی نے انگریزی زبان میں اپنا نام محمدن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اور کالج کی جگہ عربی نام میں مدرسۃ العلوم ترجمہ کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنا ہے اور جس کو دارالعلوم کہنا چاہیے اور میں امید کرتا ہوں کہ ممبران کمیٹی اس بات کو پسند کرینگے کہ بجائے لفظ کالج کے لفظ یونیورسٹی کا اور بجائے لفظ مدرستہ العلوم کے لفظ دارالعلوم کا داخل کیا جاوے۔"

اس کے بعد چھ تجویزیں اُنھوں نے پیش کیں۔

دفعہ ۲۔ اب میں اِس کمیٹی کے سامنے مفصلہ ذیل تجویزیں نسبت بندوبست اور سلسلہ تعلیم کے جو مجوزہ دارالعلوم میں ہونا چاہیے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے مجکو یہ بیان کرنا چاہیے کہ بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگراں حال رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔

۲۔ اس دارالعلوم کے پاس مستقل آمدنی اس قدر ہونی چاہیے کہ بیرونی مدد کی محتاج نہ رہے۔

۳۔ وہ علوم بھی جو کہ روزمرہ کارآمد تو نہیں ہوتے مگر اُن سے ذہن کو اور لیاقت اور استعداد کو ترقی ہوتی ہے اس دارالعلوم میں پڑھائے جاویں۔

۴- ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ جو طالب علم سلسلۂ تعلیم میں کامیاب ہو اُسی کے ساتھ اُس کو انعام اور وظیفہ بھی ملے۔

۵- سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد اگر کسی طالب علم کی عمدہ کامیابی تحصیل علوم میں ثابت ہو تو اُس کو بلا شرط خدمت صرف اُس کے ترقی علوم میں مصروف رہنے کے صلہ میں ایک معتدبہ وظیفہ ملنا چاہیے۔

۶- طالب علموں کا اور وظیفہ ترقی علوم پانے والوں کا دار العلوم میں رہنا اور اُس کے قواعد کا پابند ہونا مثل تعلیم کے ضروری سمجھنا چاہیے۔

دفعہ ۳- میں سمجھتا ہوں کہ یہ امور ششگانہ ہر ایک مدرسہ کے لیے اور بالتخصیص ایک دار العلوم کے لیے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قائم ہو نہایت مقدم ہیں اور مجھکو اس بات پر ایسا یقین ہے کہ میں بلا تامل کہتا ہوں کہ جب تک یہ باتیں نہ اختیار کی جاوینگی اُس وقت تک کوئی کوشش میری ہموطنوں کی اصلی تعلیم و تربیت کی ترقی کے لیے کامیاب نہوگی۔

پھر ان امور ششگانہ پر بحث کی ہے۔ ان میں اول و دوم امور کے متعلق اُن کی رائے تھی کہ

بیان امر اوّل | دفعہ ۴- نسبت پہلے امر کے مجھکو یہ بیان کرنا ہے کہ جب تک

اس قدر روپیہ اور جائداد جس کی آمدنی ضروری اخراجات دارالعلوم کو کافی ہو جمع نہ ہو جائے اُس وقت تک اس قسم کی شے کے قائم کرنے کا خیال دل سے کمیٹی کو نکال ڈالنا چاہیے جب تک کہ ہم ایسی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسے کہ تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسا کریں گے تو درحقیقت اُس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہی سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یورپ میں بھی بالکلیہ یا قریب اُس کے اُس مُلک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علیحدہ ہیں، اور یہ بات اُن ملکوں میں ہی جہاں کی گورنمنٹ اُسی قوم کی ہی جس کی کہ تعلیم منظور ہی پس یہ دلیل ہندوستان میں کس قدر زیادہ قوی ہو جاتی ہی جہاں کہ گورنمنٹ قریباً کل تنے کے مرکب ہی اُن لوگوں سے جو اُس قوم کے ہیں جن کی زبان اور مذہب اور خیالات ہم سے مختلف ہیں۔ اس بیان سے میری یہ غرض نہیں ہی کہ میں اُن تینوں چیزوں کے کچھ برخلاف کہنا چاہتا ہوں یا اُن میں اور اپنے میں مجھکو کچھ مقابلہ کرنا منظور ہی بلکہ صرف دلیل کو قوی کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ یہ بات قریباً غیر ممکن کے ہی کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو جو تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا اُن کا کامل طور پر بند و بست کر سکے۔ حد سے حد جو ایک تربیت یافتہ اور

روشن ضمیر گورنمنٹ سے ہو سکتی ہی وہ اُس شے کا حاصل کرنا ہی جو اب بھی ہم کو حاصل ہی یعنی دل بڑھانا اور مربّی ہونا اگر ہمارے دار العلوم سے عمدہ تعلیم بانی مقصود ہی تو انگریزی گورنمنٹ خود بخود ہماری دار العلوم کی مربّی ہو گی اور اگر کچھ روپیہ کی مدد ہم کو گورنمنٹ دے گی تو ہم کو گورنمنٹ کی نگرانی کرنے پر کچھ عذر نہو گا بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہو گورنمنٹ کی مربیانہ اور فیاضانہ مدد سے ہم اپنی تدبیر کو بہ نسبت اس کے جو گورنمنٹ موجودہ حالات میں کر سکتی ہی بہت زیادہ آسانی اور کامیابی سے انجام کو پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ کمیٹی اس امر کے منظور کرنے میں کچھ بھی تامل نہ کرے گی جس کو میں سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔

بیان امر سوم دفعہ ۶۔ مجھے اندیشہ ہی کہ آپ اس امر کی نسبت مجھ سے کچھ مخالفت کرینگے شاید آپ یہ کہیں کہ ہماری قوم کی حاجتیں فی زماننا روزمرہ کی بکار آمد چیزوں کی ہیں اور اس لیے اُن چیزوں کی مہیا کرنے کی طرف کوشش کرنا جن کی بالفعل ہم کو ضرورت نہیں ہی بیفائدہ ہی مگر میں یقیناً خیال کرتا ہوں کہ اب بھی ہم کو بہ نسبت روزمرہ کے بکار آمد تعلیم کے اصولی تعلیم کی زیادہ تر حاجت ہی جو تعلیم کہ دل کو روشن نہیں کرتی اور عقل اور اخلاق کو کامل ترقی پر نہیں پہونچاتی وہ ہمیشہ ناکامل متصور کی جاتی ہی اور اگر ہم صرف روزمرہ کی بکار آمد تعلیم پر قناعت کریں تو ہماری

قوم کے عمدہ سے عمدہ طالبِ علم اپنی قوم کے لیے اُن لوگوں سے جنہوں نے ہمارے اس دارالعلوم میں تعلیم نہ پائی ہو کچھ زیادہ فائدہ پہنچانے والے ہونگے میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑا فائدہ ہمارے دارالعلوم کا یہ ہونا چاہیے کہ مباحثہ علمی میں ہمارے طالب علموں کے طرز خیال میں تبدیلی اور ترقی ہو اور اس تعلیم کے ایسے اشخاص پیدا ہوں کہ گویا وہ اس دارالعلوم کے لیے عام لوگوں میں علوم پھیلانے اور مہذب خیالات اور عمدہ اخلاق سکھانے کے لیے مثل اوزار کے ہوں۔ اگر ہم اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے پر ناکامیاب ہوں تو ہم کو اپنے اس دارالعلوم کو بھی ایک ناکامیاب شے تصور کرنا چاہیے لیکن اگر یہ دارالعلوم جوان مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنے میں کامیاب ہوں جن کے تہذیب اور ترقی کی طرف خیالات مائل ہوں تو مجھکو کچھ شک نہیں ہے کہ اُس کا نتیجہ بے انتہا فوائد سے مالا مال ہوگا۔ جہاں کہیں ہمارے دارالعلوم کا طالب علم چلا جاویگا اُس کے ساتھ ہی وہ عمدہ اور مہذب اور ترقی کرنے والے خیالات اور زندہ علم اور اصلی اخلاق جاوینگے جن کا تعلیم دینا اور پھیلانا ہمارے دارالعلوم کا مقصد ہے اور مسلمان روز بروز زیادہ تر اپنی حالت موجودہ پر غور کرینگے اور روشن ضمیر تعلیم پھیلانے میں نہایت گرمجوشی سے کوشش کرنے لگیں گے صرف روزمرہ کی بکار آمد تعلیم جو ایک اوپری تعلیم ہوتی ہے کچھ ایک روشن ضمیر تعلیم شمار

نہیں کی جا سکتی اور اگر یہ دار العلوم مستقل اور مستحکم اور اعلیٰ تعلیم نہ بخشے گا تو اُس کس کو
ادب اور عزت اور فخر قومی کے لایق سمجھنا مشکل ہوگا۔"

اس کے بعد اُنہوں نے ان ہی امور شستگانہ کی تشریح کے طور پر اس سلسلۂ
تعلیم و انتظام کو جو اس دار العلوم میں مقصود تھا نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہی
اور آخر میں نشر و اشاعت تعلیم کے خیال سے یہ تجویز بھی پیش کی ہی کہ کوئی شخص
جو کہ اس دار العلوم میں کسی خاص علم کی تحصیل کرنے کو داخل ہونا چاہیے اور اس تمام
سلسلۂ تعلیم کو جو دار العلوم میں مقرر ہو پڑھنا نہ چاہیے تو اجازت خاص منتظمان
دار العلوم سے حاصل کر کر مدرسۃ العلوم میں داخل ہو سکتا ہی لیکن کسی وظیفہ
کے پانے کا جو دار العلوم سے ملتا ہی مستحق نہو گا تاہم اُس کو اندرونِ حدود
دار العلوم اور بہ تبعیت قواعد معینہ دار العلوم کے رہنا ہوگا۔

منتظمان مدرسۃ العلوم کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ایسے[1] اشخاص کو جو کہ مدرسۃ العلوم
میں کوئی خاص علم یا علوم پڑھنا چاہیں بہ ادائے فیس پڑھنے کی اجازت دیں لیکن
یہ اشخاص طالب علم دار العلوم کے متصور نہونگے اور نہ ان کو حدود دار العلوم
میں اور بہ تبعیت قواعد دار العلوم کے رہنا پڑیگا۔

---

[1] اس قاعدے سے ہندوؤں کو بھی مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کا موقع ہاتھ آجاویگا۔

دارالعلوم کو بلاشبہ علیگڑھ میں مقرر ہونا چاہیے جیسا کہ کمیٹی فیصل کر چکی ہے مگر مدرسے دارالعلوم کے مختلف مقاموں اور شہروں میں بھی جہاں کہیں کہ ممکن ہو مقرر ہونے چاہئیں اور جو مدرسے مشابہ مدرسہ مجوزہ دارالعلوم کے ہوں اُن کو اپنے ساتھ شامل کر لینا چاہیے تاکہ مدرسۃ العلوم کے لیے بہت سے طالبِ علم ہر ایک مقام سے تیار ہو سکیں۔"

اگرچہ اس وقت اس تجویز پر عمل نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہی اسکیم محمدن یونیورسٹی کی عملی شکل میں سرسید اور سید محمود اور ان کے رفقائے کار کی مطمح نظر رہی اور بلا خوف تردید مسلمانوں کے تعلیمی حق میں اس اسکیم کو ایک الہامی اسکیم کہا جا سکتا ہے۔ اور موجودہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد بھی روز بروز اس کی اہمیت ثابت ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ سید محمود نے کچھ عرصہ تک اسکول اور کالج میں طلبار کو ایک ٹیچر اور پروفیسر کی حیثیت سے انگریزی زبان کی بھی تعلیم دی اور بقول علامہ شبلی مرحوم۔ ان کے شاگردوں کو ان کی وسعت معلومات اور تحقیقات پر حیرت تھی۔

(۳)

چند دن کے بعد انہوں نے پریکٹس شروع کی لیکن اسی زمانہ میں سرسالار

جنگ اول نے دو ہزار روپیہ ماہوار پر ترتیب قوانین اور اصلاحِ نظامِ عدالت کے لیے مامور کیا مگر وہاں ان کا دل نہ لگا اور چھ ماہ سے زائد نہ ٹھیرے حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد جولائی ۱۸۷۹ء میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر مقرر کیے گئے۔

تین سال بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں ان کو ہائیکورٹ کی ججی پر ترقی دی گئی وہ ہندوستان میں پہلے مسلمان اور تیسرے ہندوستانی جج تھے۔ اُنھوں نے اس اعلیٰ عدالتی عہدہ کے فرائض ایسی بے مثل قابلیت سے انجام دیے کہ آج تک وہ شہرہ آفاق ہیں لیکن ۱۸۹۳ء میں چیف جسٹس سے ان کا جھگڑا ہو گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ اُنھوں نے چیف جسٹس کے متعلق گورنمنٹ کو سخت ترین تحریرات لکھیں جن میں ان کی نسبت الزام لگانے اور ان کی خصلتوں کے بیان کرنے میں کچھ فروگذاشت نہیں کی۔ مگر قبل اس کے کہ گورنمنٹ کوئی فیصلہ کرے سید محمود نے اس بنا پر کہ اس قدر نااتفاقی اور مخالفت کے بعد چیف جسٹس کے ساتھ مل کر کام کرنا ممکن نہ تھا استعفا دیدیا اس کے علاوہ ان کو اب ملازمت کرنا بھی منظور نہ تھا گورنمنٹ نے استعفا منظور کر کے ۶۰۰ پونڈ (نو ہزار) سالانہ کی خاص پنشن مقرر کی۔

(۴)

سید محمود نے دورانِ ملازمت میں مسلمانوں کی تعلیم اور کالج کے کاموں

میں جہاں تک ممکن تھا مصروفیت رکھی اور جس طرح کالج کے ابتدائی انتظامات میں جو مشکلیں پیش آئیں اُن کے حل کرنے میں سرسید کے زبردست مددگار رہے اسی طرح جب کالج نے ایم۔ اے کے درجہ تک ترقی کرلی تو بھی معاملات تعلیم، اسٹاف کے انتخاب و تقرر اور ان تمام تجاویز میں جن کا تعلق ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اور گورنمنٹ سے تھا، سرسید کی طرف سے سید محمود ہی کُل کام انجام دیتے اور سکرٹری کے دفتر کی تمام اہم چٹھیاں ان ہی کی لکھی یا لکھوائی ہوئی ہوتیں۔

چونکہ اب کالج نے بہت کچھ ترقی حاصل کرلی تھی۔ اور سیلف ہلپ کے اصول پر یہ پہلا کالج تھا جس کا تعلق تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا اس لیے ۱۸۸۹ء میں سرسید نے سید محمود، مسٹر اسٹریچی بیرسٹر اور یوروپین اسٹاف کے قائم مقام کے طور پر پرنسپل کو شریک مشورہ کرکے کالج کے لیے ایک قانون مرتب کیا اور اس قانون کی رو سے سید محمود کو اپنے بعد لائف آنریری سکرٹری بنایا جس کا سبب اُن کے الفاظ میں یہ تھا کہ "یہ کالج جس مقصد اور جس پالیسی سے میں نے قائم کیا ہے اور جس نتیجہ قومی ترقی پر میں نے اس پر محنت کی ہے میرے بعد بھی اسی طرح اور اسی نتیجہ پر کالج چلے۔ سید محمود ابتدا سے آج تک اُن تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے ہیں اور مجھکو اس بات کا کامل یقین ہے کہ سوائے سید محمود

کے اور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔ مگر ہاں ایک مدت بعد جب بخوبی مستحکم ہو جائے گا تو ہر کوئی چلا سکے گا"

اس کے علاوہ سید محمود کی اعلیٰ انگریزی قابلیت اور وہ اعتماد جو یورپین فضلا کو ان ہی کی ذات پر ہو سکتا تھا اس بات کا مقتضی تھا کہ سرسید کے بعد وہی ان کے جانشین ہوں۔ مگر اس تجویز اور کارروائی سے اختلاف کیا گیا۔ اور مولوی سمیع اللہ خاں سی۔ ایم۔ جی اور بعض دیگر اصحاب نے جو آغاز کار کے رفیق تھے سخت مخالفت کی۔ تاہم سید محمود کثرت رائے سے سرسید کی زندگی تک جائنٹ سکرٹری اور انتقال کے بعد لائف سکرٹری قرار دیے گئے۔

جب ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہوا ہے تو سرسید نے بارہا یہ بات کہی کہ "میرا جو اصلی مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغہ میں چاہے اور کتنی ہی ترقی کریں مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی" اب جبکہ وہ مستعفی ہو گئے تو سرسید نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ وہ ان کے زیر نگرانی علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کر کے قومی کاموں میں اپنا وقت صرف کریں اور اپنی اعلیٰ قابلیتوں سے قوم کو فائدہ پہنچائیں چنانچہ وہ قومی کاموں میں زیادہ

انہماک کے ساتھ مصروف رہنے لگے۔

اگرچہ ان کی قانونی قابلیتوں کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی اور یہ بھی سب جانتے تھے کہ انھوں نے قومی درد کا ورثہ اپنے پدر درد اور ہمدرد باپ سے حاصل کیا ہے اور طبقہ خواص اُن کی اُن خاموش خدمات سے بھی واقف تھا جو انھوں نے کالج کے بنیادی خاکہ سے موجودہ تعمیر تک کی تھیں لیکن ۱۸۹۳ء میں کانفرنس کے اجلاس منعقدہ علیگڑھ میں پبلک کو پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ کس قدر زبردست اور خوش بیان لیکچرار بھی ہیں جبکہ انھوں نے صد سالہ (من ابتدائے ۱۷۹۳ء لغایتہ ۱۸۹۳ء) تاریخ تعلیم انگریزی پر ایک زبردست اور مبسوط لیکچر دیا۔

اس لیکچر کا سب سے مقدم اور بڑا حصہ تاریخانہ حال ابتدائے تعلیم انگریزی کا ہے کہ اس کا آغاز کیونکر ہوا اور کن مقاصد اور کن اصولوں کے مطابق اس نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور پھر جبکہ گورنمنٹ نے تعلیم انگریزی کو ایک مستقل صیغہ اپنی سلطنت اور انتظامِ مملکت کا گردانا تو اس کا کیا اثر ہوا اور موجودہ حالت اعلیٰ تعلیم انگریزی کی مسلمانان ہندوستان میں کیسی ہے اور اس سے کیا توقع رکھنی چاہیئے۔

آخر میں اعداد شمار سے ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز بحث تھی اور ہندو مسلمانوں میں نسبتی ترقی کو نمایاں کرنے کے لیے ڈائیگرام لگائے تھے۔

یہ لیکچر تمام سرکاری دستاویزات اور نایاب انگریزی کتابوں کے ہزاروں ورق اُلٹنے اور اُن پر غور و خوض کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا۔

یہ لیکچر کیسا تھا، کس طرح مرتب کیا گیا تھا، اُس نے کس حقیقت کو نمایاں کیا اور دلوں پر کیا اثر پیدا کیا اور کس قسم کی رہنمائی کی؟ اس کا جواب اُس کانفرنس کے پریسیڈنٹ نواب محسن الملک کی زبان سے ہی زیادہ وضاحت اور جامعیت کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، اُنھوں نے لیکچر ختم ہونے کے بعد میر مجلس کی حیثیت سے کہا کہ

"درحقیقت اس لیکچر کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے ہم اس کی ترتیب کی تعریف کر سکتے ہیں اُس کے نقشوں اور ڈایگراموں کی خوبی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر اُن کی تحریر اور تقریر اور الفاظ و معانی اور طرز ادا اور جوشِ بیان نے جو اثر دلوں پر کیا ہے، اور جس ظرافت آمیز فصاحت سے اُنھوں نے تاریخانہ حالات بیان کیے ہیں، اور جس خوبی سے اُنھوں نے اپنی قوم کی تعلیم کی سچی تصویر کھینچی ہے، اور جن دردناک واقعات کا اُنھوں نے بیان کیا ہے، اُن سب باتوں نے من حیث المجموع ایک ایسی حالت طاری کر دی ہے کہ اُس کی کیفیت سننے والوں کے دل جانتے ہیں اُسے کوئی کس طرح بیان کر سکے۔

اسلام

درحقیقت اس لیکچر کی نسبت یہ کہنا کہ "عطر آنست کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار بگوید"

ایک حکایت نفس الامری ہے نہ شاعرانہ مثال۔ میں جانتا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کیسی محنت اس لیکچر کی تیاری میں لیکچرار نے اُٹھائی ہے، اور کتنی کتابیں اور کے ہزار صفحے اُس کے لیے اس یار عزیز نے پڑھے ہیں، اور کس قدر اُس کے مواد جمع کرنے کے لیے اُس کو زحمت اُٹھانی پڑی ہے۔ کن کن باغوں میں وہ گئے اور کہاں کہاں سے پھول لائے، جس کا عطر کھینچ کر اس وقت آپ کے سامنے پیش کیا اور میں سے اس بات کا کہ سید عطر فروش ہوا کرتے ہیں اُنھوں نے ثبوت دیا۔ اس لیکچر کی تیاری میں جو محنت اُنھوں نے اپنے اوپر گوارا کی اُس کا اندازہ آپ اس لیکچر کے مضامین اور تاریخانہ واقعات اور ہندسوں اور نقشوں اور ڈائگراموں سے کر سکتے ہیں۔ درحقیقت جس خوبی سے ان مضامین کو اُنھوں نے ترتیب دیا، اور تاریخانہ واقعات کے بیان میں ظرافت کی چاشنی جس طرح سے ملائی، اور ایک روکھے پھیکے مضمون کو جس طرح اُنھوں نے بامزہ کر دیا، یہ اُنھیں کا حصہ تھا، اور ایک ایسے مضمون پر جس میں بہت کچھ کہا جا چکا ہو ایسا لکچر دینا، جو نہ صرف فی الوقت مؤثر ہو بلکہ جو ہمیشہ بکار آمد اور ہر وقت غور کے لائق ہو، اور جس کو قوم اور گورنمنٹ تعلیم کے متعلق ایک ضروری اور اہم رکارڈ سمجھے، اُنھیں کے لیے رہ گیا تھا۔ اس لکچر کے فائدے اور اُس کی خوبیاں اُسی قدر زیادہ معلوم ہوتی جائیں گی جس قدر

اُس پر زیادہ غور کیا جائیگا اور جس قدر زیادہ توجہ سے اُس پر نظر ڈالی جائیگی۔

صاحبو! یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک ایسا صحیفہ ہی جو اُن کی نظر سے کبھی نہ گزرا تھا۔ اور اس میں وہ واقعات درج ہیں جو اُنھوں نے کبھی نہ سُنے تھے، وہ ایک تاریخ ہی اُس انقلاب کی جو مسلمانوں کی حالت میں سلطنت کی تبدیلی سے پیدا ہوا، اور ایک سلسلہ ہی اُن واقعات کا جو اُصول تعلیم کے تغیر سے مسلمانوں پر پیش آئے۔ اس سے وہ نتیجے ظاہر ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے تعصب اور غفلت نے اُن کو دکھائے۔ اور اس سے اُن کا وہ مقام معلوم ہوتا ہی جو اُنھوں نے علم کے میدان میں حاصل کیا اور پھر اُن واقعات کے بیان میں نہ مبالغہ ہی نہ رنگ آمیزی، نہ مضامین کو فصاحت کے سانچہ میں ڈھال کر اپنی مرضی کے موافق بنایا ہے نہ دلوں پر اثر ڈالنے کے لیے استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے بلکہ تمام واقعات ہندسی دلائل پر مبنی ہیں اور ہر چیز کا ثبوت علم الاعداد سے دیا ہی۔

میرے نزدیک ایسی سچّی تصویر مسلمانوں کی حالت کی غالباً اب تک کسی نے نہ کھینچی تھی اور ایسا صاف آئینہ قوم کے سامنے اب تک کسی نے نہ رکھا تھا، جس میں وہ اپنی گزشتہ اور موجودہ حالت کی صورت اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اور اپنے

عیب اور صواب کو بخوبی سمجھیں۔ درحقیقت ایک لحاظ سے میرے عزیز اور پیارے محمود نے نہایت دانشمندانہ کام کیا۔ اور مسلمانوں کی نصیحت اور قوم کو اپنی حالت پر مطلع کرنے کا نہایت عمدہ ڈھنگ نکالا۔ اُن کے باپ یا کسی اور نے جو کچھ مسلمانوں سے کہا اُس کے الفاظ سخت ہوا کرتے تھے اور مسلمانوں کی اصلی حالت کا بیان تلخ معلوم ہوتا تھا، مگر سید محمود نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو ناگوار ہوا ہو، اور ایک فقرہ بھی ایسا نہیں لکھا جو کسی نے نہ پسند کیا ہو، یا جسے سُن کر کسی کو غصہ آیا ہو، اُن کا سارا لکچر پڑھ جائیے۔ اُس میں کچھ بھی نہیں سوائے واقعات کے بیان، اور حالات کے اظہار، اور ہندسوں اور رقموں کے لیکن جب غور سے دیکھئے، تو مسلمانوں کے تعصب اور جہالت اور اُن کی غفلت اور غرور کا ثبوت جیسا اُس سے ہوتا ہے اور وہ ہندسے اور نقشے جیسا مسلمانوں کی پست اور ذلیل حالت کا بیان کر رہے ہیں، وہ نہ کبھی سرسید احمد خاں نے کیا نہ کبھی مولوی نذیر احمد نے، نہ کسی مقرر اور کسی لکچرار نے۔ اُنھوں نے جھگڑنے اور عیوب بیان کرنے اور غصہ دلانے سے پرہیز کیا۔ صرف ایک صاف آئینہ قوم کے ہاتھ میں دیدیا کہ وہ اپنی اپنی صورت اُس میں دیکھ لیں۔

حضرات! کیا میرا یہ کہنا مبالغہ ہے، کیا وہ پست حالت مسلمانوں کی جو اس لکچر نے

دکھائی، اور کیا مسلمانوں کی اُس کمی کا جو بمقابلہ ہندؤں کے تعلیم میں ان نقشوں سے ظاہر کی اُس کا صحیح اندازہ کبھی اول آپ نے کیا تھا اور کیا ایسی خوفناک صورت مسلمانوں کی حالت کی جو اس وقت آپ نے دیکھی آپ کے خیال میں تھی۔
بلاشبہ سب سمجھتے تھے کہ مسلمان ہندؤں سے تعلیم میں کم ہیں اور سب کو خیال تھا کہ انھوں نے سرکاری مدارس سے کم فائدہ اُٹھایا ہے مگر کسی کے خیال میں یہ نہ تھا کہ وہ بمقابلہ ہندوؤں کے اتنے کم ہوں گے اور تعلیم میں اُن کی حالت ایسی خراب ہوگی۔ بہرحال ایک نئے ڈھنگ سے نہایت خوش اسلوبی سے سید محمود صاحب نے مسلمانوں کی حالت دکھا دی اور چند لکیروں میں ساری قوم کی پچھلی اور موجودہ کیفیت ظاہر کر دی۔
حضرات! اُن کا ہائی کورٹ سے جدا ہونا نہایت رنج دہ تھا۔ جہاں تک مجھکو معلوم ہے قوم کو اس کا نہایت صدمہ تھا۔ مگر آج ہمارا وہ رنج جاتا رہا۔ اور اُنھوں نے قومی خدمات کرنے سے اُس کا نعم البدل دیدیا۔ بلاشبہ ہائی کورٹ کی ججی پر ایک مسلمان کا مقرر ہونا باعث فخر تھا مگر فائدہ اُس کا محدود اور فانی تھا۔ البتہ قومی تعلیم اور تربیت کی اشاعت ایک ایسا کام ہے جس کا نفع عام اور ہمیشہ باقی ہے۔ بسبب سرکاری ملازمت کے وہ قومی خدمت کرنے سے

معذور تھے۔ اور نہ جیسی کہ چاہیئے ججی کی حالت میں وہ مرضی کے موافق کام کر سکتے تھے۔ مگر اب وہ آزاد ہیں اور تمام قیدوں سے بری۔ اب وہ قوم کو اپنے دل و دماغ سے وہ فائدے پہونچا سکتے ہیں جو ججی کی حالت میں کبھی نہ پہونچا سکتے تھے اُن کا علم وسیع ہی اور طبیعت سلیم، اُن کا دل پاک ہی اور دماغ بلند، خیالات اُن کے پاکیزہ ہیں۔ تعصب اور نفسانیت کا اُن میں نام نہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہی کہ مسلمانوں کو اُن پر اعتماد ہی اور کُل قوم اُن پر بھروسا رکھتی ہی۔ نہ اُن پر کفر کے فتوے جاری ہوئے نہ کبھی مسلمانوں نے اُن پر طعنے کیے۔ اور نہ کبھی تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھے اور نہ مخرب الآفاق مشہور ہوئے وہ ہمیشہ اُن جھگڑے قصوں سے علٰحدہ رہے۔ آج پہلا دن ہی کہ اُنہوں نے اسٹیج پر قدم رکھا ہی اور اپنے دل اور دماغ کے جوہر دکھلائے۔ اُنھوں نے اپنی طلاقتِ لسان اور فصاحتِ بیان اور شیرینیٔ زبان سے اُن اُمیدوں کو تازہ کر دیا جو اُن کی ذات سے قوم کو تھیں۔ اور اُنھوں نے اپنے اعتدالِ خیالات اور سلامتِ طبیعت دکھا کر اس بات کا یقین کرا دیا، کہ وہ نہ صرف لائق باپ کے لائق فرزند ہیں، بلکہ بعض باتوں میں اُن سے بھی فائق ہیں۔ آج اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف قانون ہی میں اعلیٰ لیاقت نہیں رکھتے تھے اور ایک عمدہ جج ہی نہ تھے بلکہ اُن کا علم بھی ویسا ہی وسیع ہی

اور قومی خدمت کے لیے بھی وہ ہر طرح سے موزوں ہیں اور جو صفات ایک آدمی
میں مشکل سے جمع ہو سکتے ہیں وہ اُن کے جامع ہیں ؎

این کہ مے گویند آں خوشتر ز حسن
یار ما این دارد و آں نیز ہم

صاحبو اب میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا اور کتنا ہی کہو نہ لکچرار کے ذاتی
صفات کا نہ اُن کے عمدہ اور بینظیر لکچر کی خوبیوں کا بیان کر سکتا ہوں اس
لیے میں مجلس کی اس خواہش کو ظاہر کر کے اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوں کہ سید محمود
کی اس قومی خدمت کا جو ہمیشہ آیندہ آنے والی نسلوں تک یاد رہیگی شکریہ
ادا کیا جاوے اور اُن کی صحت اور سلامتی کی دعا مانگی جاوے"

سید محمود کے اس لیکچر نے صرف دلوں پر ہی نہیں بلکہ جیبوں پر بھی اثر ڈالا
اور منشی محمود جان رئیس بکا سرائے ضلع جونپور نے پانسو روپیہ اس لیکچر کی یادگار
کے لیے دیا جس کا یادگاری کتبہ اسٹریچی ہال میں لگایا گیا۔

اس کے بعد ۱۸۹۲ء کی کانفرنس میں اسی لکچر کے سلسلہ میں اُنھوں نے
دوسرا لیکچر دیا جس میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا تذکرہ کر کے مسلمانوں
کے خیالات و تعصبات وغیرہ کو جو انگریزی تعلیم کے متعلق تھے تفصیل کے ساتھ

بیان کیا اور پھر مسلمانوں اور دیسی عیسائیوں کے تناسب آبادی سے ان کے
تناسب تعلیم کا مقابلہ کر کے دکھایا کہ مسلمان چھ کروڑ کی آبادی میں ۳۲۲۸۳
انگریزی پڑھے ہوئے ہیں اور دیسی عیسائی اُنیس لاکھ کی آبادی میں چار ہزار
چار سو اُنچاس ہیں گویا یہ تینس گنا بڑھے ہوئے ہیں اسی طرح اُنھوں نے علم الاعداد
سے تمام حالت کو آئینہ کر کے دکھا دیا پھر اُنھوں نے چند تدابیر بتائیں کہ مسلمان
تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کون کون سے پیشے اختیار کرنے چاہئیں
کہ اپنی زندگی اچھی طرح بسر کر سکیں۔

آخر میں اُنھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ حالت کب ہو گی کہ سب
مل کر کہیں گے کہ آج آخری رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مسلمان تعلیم میں ۲۳،۷۵
ہیں۔ وہ دن آئے یا نہ آئے میری حیات وفا کرے یا نہ کرے لیکن میرا ذاتی خیال اور دلی جوش
کل مسلمانوں کے دل میں بٹھائے کہ ان کی اصلی چیز جو بمنزلہ معشوقہ ہے اعلیٰ تعلیم ہے۔
میں چاہتا ہوں کہ سب میرے ساتھ متفق ہو جائیں اور دل سے لیسے ہی
کہیں جیسے میں کہتا ہوں ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

یہ لیکچر بھی کیسا تھا؟ بقول (آنریبل مسٹر جسٹس) شاہ دین بیرسٹر ایٹ لا صدر کانفرنس۔

"یہ لیکچر صرف ایک لیکچر نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک صدائے عام ہے کہ اپنی خوبروئی اور خوش خرامی پر ناز کرنے والو آؤ۔ دم بھر کے لیے اس آئینہ خانہ میں ہو تے جاؤ تاکہ تم کو خود معلوم ہو جائے کہ تمہاری جماعت نوجوان، قوی ہیکل، وجیہہ ترکوں کا ایک جرّار لشکر ہے یا کہن سال، گرسنہ شکل، کریہ منظر حبشیوں کا ایک گرد آلود فرقہ۔ تم کو یقین ہو جائے کہ ہاں تم اس دوسرے گروہ کے ہم شکل اور ہم رکاب ہو تو اس حبشی کی طرح جس نے پہلے ہی دفعہ آئینہ میں اپنی بھونڈی سی شکل دیکھکر آئینہ کو جھنجھلا کر توڑ ڈالا تھا۔ یہ کہکر معاذ اللہ یہ کیا برا آئینہ ہے تم بھی کہیں اس لیکچر کو پھاڑ نہ ڈالنا اس طیش میں آکر کہ تو بہ توبہ مسلمانوں کی قوم پر جو بلاشک خیر الامم ہے کیسے الزام لگائے ہیں۔ خدانخواستہ ہم کیوں ایسے ہونے لگے۔ ہاں ہم ایسے، ہم ایسے"

اس لیکچر سے متاثر ہو کر نواب محمد علی خاں صاحب (مالیر کوٹلہ) نے ایک ہزار روپیہ کالج کو دیا۔ اسی اجلاس میں ندوۃ العلما کے قیام کا ایک تائیدی رزولیوشن

نواب محسن الملک نے پیش کیا تھا اور اس کو پیش کرتے ہوئے اس کی ضرورت پر ایک معرکۃ الآرا تقریر بھی کی تھی۔ سید محمود نے ایک مہتم بالشان تقریر میں اس تحریک کی تائید کی۔ چونکہ اس تقریر سے ان کے وہ خیالات جو مذہبی تعلیم کی ضرورت واہمیت کے متعلق ہیں اور اُن کی وہ بالغ نظری جو مذہب اور علومِ مذہب کے متعلق تھی نمایاں ہوتی ہے اور جس پر ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو توجہ کرنی چاہیے اس لیے اس کے چند اہم اقتباسات ہم درج کرنے مناسب و ضروری جانتے ہیں۔

اُنھوں نے ابتدائی اور تمہیدی جملوں کے بعد اس مسئلہ پر بحث کی کہ کانفرنس اور ندوۃ العلما کے مقاصد میں باہم کسی قسم کا تناقص نہیں ہے پھر اُنھوں نے ندوۃ العلما کی روئدادوں سے ندوۃ العلما کے قیام کے اغراض و مقاصد کو بیان کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ اے حضرات انگلستان میں جہاں کہ علوم و فنون جدیدہ کی ترقی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے اور جہاں کہ دنیوی ثروت اور مال و متاع غایت درجہ پر ترقی کر گئے ہیں وہاں بھی ایک عظیم الشان فرقہ پادریوں کا ہے کہ جو دین عیسوی کے علما ہیں ہزاروں گرجاؤں میں وعظ کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو نہ تجارت سے نہ حرفت سے

نہ زراعت سے کچھ تعلق ہے بلکہ اپنا کل وقت اور جد وجہد اپنے دینی علوم کی اشاعت
اور ترقی میں صرف کرتے ہیں مختلف انجمنیں اور سوسائٹیاں اُن کی امداد
اور گزر اوقات کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اس ندوۃ العلما کے قائم کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ مسلمانوں نے قومی ترقی کے اِس صیغہ کی طرف
توجہ کی ہے کہ جس سے اشاعتِ علوم دینی و استحکامِ عقائدِ اسلام مقصود ہے۔
اے حضرات۔ ایسے مقاصد کو کون ناپسند کرسکتا ہے کہ جس کے دل میں نور
ایمان ہو؟ تمام دنیا میں چند قسم کی رائے کے آدمی ہوتے ہیں کہ اُن کے اندرونی
خیالات کو چند مدات قائم کر کے منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اُس لاپرواہ اور خفتہ مغز
گروہ کو جانے دو جو قوم اسلام کی دینی و دنیوی دونوں حالتوں سے بے اعتنائی
رکھتے ہیں اور جن کو نہ یہ پرواہ ہے کہ دین اسلام قائم رہے یا نہ رہے اور قوم
اسلام ذلیل و خوار ہو یا نہ ہو۔ اُن بیچارے واجب الرحم لوگوں کو بھی جانے دو
کہ جو بوجہ اپنی نادانی اور جہالت کے رفتار زمانہ سے اور اصلی قومی حالات سے
ناآگاہ ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت اب بھی ایسی ہے کہ اُس پر رنج
و افسوس کرنا نادرست ہے اور اُس کی حالت محتاج ترقی نہیں ہے۔ مگر اُن
اعلیٰ خیال لوگوں کو لینا چاہیے کہ جو چشم عبرت بیں اور نظرِ بصیرت رکھتے ہیں

اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تعمق کرتے ہیں اور اُس کے خراب ہونے کے معترف ہیں۔ ایسے لوگ مولانا الطاف حسین حالی کی اس حقیقت آموز رُباعی سے اتفاق کرتے ہیں۔ رُباعی

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہی ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

بہی خواہانِ قوم اسلام اور ساعیانِ ترقی مسلمانان سب اِس دردانگیز رُباعی کی تصدیق کرتے ہیں اور اس رُباعی کو اپنے قومی خیالات کی عبارت سُرخی گردانتے ہیں۔ پھر مسلمانوں میں بلکہ کُل دنیا کے آدمیوں میں ایسا فرقہ ہے کہ جن کی آرزوئے دلی اور تمنائے زندگی اور عقیدۂ باطنی اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا ۔۔۔ ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

اس فرقہ کے نزدیک کیسا دین اور کیسا ایمان، کیسا فلسفہ اور کیسے معقولات کیسی دینیات اور کیسی عبادات۔ وہ لوگ کُل اپنا جد و جہد زرکشی میں صرف کرتے ہیں اور اُن کا مدعائے زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس سے مبلغ علیہ السلام ہاتھ میں آوے۔ اس فرقہ کا مدِمقابل وہ فرقہ ہے کہ جن میں سے بعض واعظین اب بھی کم عقل لوگوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　　این خیال ست و محال ست و جنوں

اور اُن کو یہ سمجھاتے ہیں کہ جو شخص دنیوی بہبودی چاہتا ہے اُس کو عاقبت میں اُسی قدر عذاب ہوگا کہ جس قدر دنیا میں اُس کو مرفہ الحالی نصیب ہو۔ اور اس گروہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیندار مسلمانوں کو دنیا کی ثروت کی جستجو نہیں کرنی چاہیے۔

پھر ایک تیسرا فرقہ ہے کہ جو اپنے تئیں معزز فلسفی سمجھتے ہیں اور اپنے تئیں سب لوگوں سے اعلیٰ سمجھ کر بنظر مشیخت مآبی یہ کہتے ہیں کہ ؎

تہی دستیم از سود و زیانِ ما چہ می پرسی　　　دریں بازار قلاشی نہ دیں دارم نے دنیا

ز دنیا نفرتے دارم ز عقبیٰ وحشتی دارم　　　بدیں ساماں منم سلطان دار الملک استغنا

اے حضرات۔ آپ خود تصور فرمائیے کہ وہ لوگ جو اِن تینوں مدات میں سے کسی مد کے نیچے داخل ہیں اور اُن کے خیالات ایسے ہوں کہ دنیا کی ثروت کو شیطان کی استعانت سمجھیں اور دنیا میں ذلیل و خوار مفلس اور خستہ حال رہنے کو دلیل جنت اور نجاتِ اُخروی گردانیں ایسی قوم میں کیونکر ترقی ہو سکتی ہے اور جبکہ ہم تاریخی حالات پر غور کرتے ہیں اور مسلمانوں کے موجودہ تنزل پر نظر ڈالتے ہیں اور اُس کے اسباب بہل انگاری اور دنیوی ترقی سے بیزاری او

دیگر ہیچ کی غفلت جو بہ پیرایہ درویش منشی و بحیلہ خدا پرستی ظاہر کی جاتی ہے پاتے ہیں
تو اس کانفرنس کو کہ جس کا اول اصول مسلمانوں کی دینوی بہبودی اور سُرخروئی
مراد ہے اُس کو دیکھنا چاہیے کہ آیا انجمن ندوۃ العلما بھی اسی قسم کے خیالات کی ترقی
دینا چاہتی ہے کہ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ نواب محسن الملک بہادر نے اپنی
تقریر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ چونکہ انجمن ندوۃ العلما کا مقصد علوم کی ترقی ہے لہذا
اس کانفرنس کے مقاصد سے اُس کے مقاصد تناقض نہیں ہیں اور اس
لیے اس کانفرنس کو اُس کے ساتھ یگانگت اور ہمدردی ظاہر کرنی چاہیے
میں نے بذاتِ خود اِس رزولیوشن کی تائید کرنے یا نہ کرنے کا معیار یہ گردانا
ہے کہ اگر انجمن ندوۃ العلما صرف یہ رائے رکھتی ہے کہ ؎

ہم خداخواہی وہم دنیائے دوں　　　این خیال ست و محال ست و جنوں

تو بندہ کو نہ اُن کی کارروائی سے کچھ تعلق نہ اُن کے مقاصد سے کوئی
تعرض اور نہ اُن کی امداد کے رزولیوشن کی تائید سے کچھ غرض۔ لیکن اگر انجمن
ندوۃ العلما کا خیال اور ارادہ بہ تفسیر اُس شعر مولانا روم کے جو میں ابھی پڑھ چکا ہوں
یہ بھی خیال ہے کہ ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

تب میں انجمن ندوۃ العلما کی کارروائی پر مرحبا اور جزاک اللہ پکارتا ہوں اور صدق دل سے اِس کانفرنس کی طرف سے کہتا ہوں کہ ہم تمہارے دوست اور تم ہمارے دوست۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ تمہاری ترقی ہو اور تم کامیاب ہو۔ تمہاری بھی وہی آرزو ہے جو ہماری ہے یعنی قوم اسلام کی ترقی و بہبودی اور قومی علما کے انفاس متبرکہ سے اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کی فرخندہ حالی پیدا ہو گی۔

مگر اے حضرات۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر جو بات میرے دل میں اثر کیے ہوئے ہے اور جس کی وجہ سے میں نے اِس رزولیوشن کی تائید کی ہے وہ یہ امر ہے کہ ہم مسلمانوں میں کون ایسا ہے کہ جو بالفاظ کلام ربّانی یہ دعا نہ مانگتا ہو کہ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ یعنی دعا میں دین اور دنیا دونوں کی بہتری چاہتے ہیں۔ بلکہ کلام ربّانی میں بہتری دنیا کو اوّل بیان کیا ہے اس لیے کہ زمانہ کے اعتبار سے دنیا کی بہتری پہلے نصیب ہوتی ہے اور آخرۃ کی بہتری متعاقب حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس دعا کے دونوں رکنوں کو یاد رکھنا چاہیے اور ہم ممبران محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جو کہ قوم کی بہبودی دنیوی کے لیے انگریزی کے علوم وفنون کی تعلیم مسلمانوں کو دینا چاہتی ہے تو اُس کو پورا موقع انجمن ندوۃ العلما سے یہ کہنے کا ہے کہ سبحان اللہ فی الاخرۃ حسنۃ کے لیے آپ کوشش فرمائیے

اور خدا کرے آپ کو ہر قسم کی کامیابی ہو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

اے حضرات! چند باتیں میں اور عرض کرنی چاہتا ہوں۔ بعض انگریزی داں لوگوں کا یہ خیال ہے زبان انگریزی میں اب ایسے اعلیٰ درجہ کے علوم و فنون کی کتابیں ہیں کہ جو لوگ علوم عربیہ خواہ معقول خواہ منقول ہوں اُن کی تحصیل میں محنت و مشقت کرتے ہیں اُن کی تضیع اوقات ہوتی ہے اور ایسے عالموں کا نتیجۂ اوقات بسری افلاس اور گداگری ہوتا ہے۔ اس خیال میں دو فاش غلطیاں مضمر ہیں اوّل تو یہ محض غلط رائے ہے کہ عربی کتابوں میں جتنے علوم موجود ہیں وہ سب ناکارہ اور بے سود ہیں۔ جو علوم متعلق بہ دینِ اسلام ہیں اُن میں سے سوائے کلام اللہ اور مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اور علم فرائض میں سراجیہ کسی ایک بھی عربی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا ہے اور علوم تاریخ اقوام اسلام کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ بلکہ اکثر انگریزی مصنفوں نے جو کتابیں تاریخ اسلام یا مسائلِ مذہبِ اسلام کی نسبت تحریر کی ہیں اُن میں بہت سی سخت غلطیاں بلکہ لغو بیان موجود ہیں اور فی الحقیقت وہ دن قوم مسلمانان کی سخت بدبختی اور شوم طالعی کا ہوگا کہ جب اُن کی قوم میں ایسے عربی داں علمائے کبار موجود نہ ہوں گے کہ جو ہماری قوم کو اصلی عربی کی کتب دینی مثل حدیث و فقہ سے ہمارے مذہب اور ہمارے عقائد

ورقانون اسلام یعنی شرع محمدی سے آگاہ کرسکیں۔ قطع نظر صرف مذہب کے عربی
زبان میں ایک عظیم الشان گنجینہ علوم معقولی ومنقولی موجود ہی کہ جس سے ہماری قوم
کے اکابر سلف کے طرز خیال اور خصائل وطریق تمدن ومعاشرت معلوم ہوتے
ہیں اِس بے بہا گنجینۂ علم وفضل کی کلید ہماری قوم کے علما کے ہاتھ میں ہی کہ جن
کی ذات بابرکات سے اسلام کا استحکام اور قوم کی عزت قائم رہتی ہے اور اُن کے
انفاسِ متبرکہ سے وہ سرچشمے فیض روحانی کے جاری رہتے ہیں کہ خشکی وجہ سے قوم
کی شادابی اور سرسبزی متصور ہی اور جن کے نہ ہونے سے قوم کی حالت بجائے
چمنستان کے خارستان کہلائے جانے کی مستحق ہوگی اور جن چشموں کے خدانخواستہ
خشک ہوجانے سے تشنگانِ فیضِ روحانی کو پیاس بجھانے کا موقع نہ رہے گا۔ غرضکہ
ہماری قوم کے علوم عربیہ کے ترقی پانے سے ہمارے آبا واجداد کی ماضیہ ثروت
اور اُن کی بیدارمغزی اور علوہمتی اور خداشناسی کی یادگار زندہ رہتی ہی۔
اے حضرات۔ قطع نظر ان امورِ دینی کے ایک اور امر قابل عرض ہے کہ
جس کی نسبت میں رائے قائم کرنے کا کسی قدر منصب رکھنے کا دعویدار ہوں وہ
یہ ہی کہ آپ صاحبوں کو بخوبی معلوم ہی کہ سرکار دولتمدار انگلشیہ کا ہندوستان میں
حکومت کرنے کا ایک مقدم بلکہ اعظم اصول یہ ہی کہ مسلمانوں کے اندرونی معاملات

زندگی میں مداخلت نہیں کرتی یعنی اُن کے مذہب میں کچھ دست اندازی نہیں کرتی اور نہ اُن قوانین میں جو اُن کی ذات پر صرف اثر رکھتے ہیں۔ مثلاً قانون نکاح و طلاق و وراثت و وصیت غرضکہ جملہ اس قسم کے امور میں بحکم قانون ہائے پارلیمنٹ انگلستان و نیز قوانین مجریہ کونسل حضور گورنر جنرل ہند مسلمانوں کے مقدمات میں شریعت محمدی جاری ہے اور اُسی کے مطابق عدالتوں کو عمل کرنا اور فیصلہ کرنا واجب ہے۔ پس دنیوی اعتبار سے بھی ہماری قوم کو نہایت ضرورت ہے کہ اُن کی قوم میں سے ایک معزز اور محترم حصہ علوم عربیہ سے اور مسائل شریعت سے آگاہ موجود رہے کہ بروقت ضرورت اپنی قوم کے اندرونی معاملاتِ تمدن و معاشرت میں اُن سے مسائل استفسار کرسکیں اور ایسے معاملات میں عدالت ہائے ہند میں ابتری نہ پیدا ہونے پاوے جتنی کتابیں کہ اب تک انگریزی میں شرع محمدی پر لکھی گئی ہیں وہ ایسی ناکافی اور بعض مقامات پر غلط ہیں کہ اگر کوئی وسیلہ اصل عربی کی مستند کتب فقہ کے دیکھنے کا باقی نہ رہے گا تو مسلمانوں کی قوم کے قانونی عملدرآمد میں نہایت ابتری کا اندیشہ ہے ۔ حال یہ ہے کہ ہماری قوم کی جورسپروڈنس یعنی اصول فقہ کی کتابیں سب علوم عربیہ میں لکھی ہوئی ہیں اور نیز خود فقہ کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں سب عربی میں ہیں اور اگر ہماری قوم میں علما نہ رہے تو

نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ صدہا برس کی محنت شاقہ جو زمانۂ سلف کے علمائے کبار نے
صرف کر کے ہماری قوم کی ہدایت کے لیے تصنیف کی ہیں وہ ہماری قوم کے
لیے بیکار ہو جاوینگی اور کل قوم اسلام کی مذہبی و تمدنی و قانونی حالت میں ایسا
زلزلہ اور انقلاب پیدا ہوگا کہ نعوذ باللہ من ذالک قطع نظر اس کے جو لوگ کہ
اعلیٰ درجہ کی کتب عربیہ سے آگاہ ہیں اور نیز علوم انگریزی کو جانتے ہیں اُن کے
دل میں خواہ مخواہ عربی علوم کی عظمت جاگزین ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں
کہ عربی میں اصول فقہ اور خود علم فقہ کی ایسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں موجود ہیں کہ میں
بحیثیت قانون داں ہونے کے بلا تامل یہ کہتا ہوں کہ اُن کتابوں کے مصنفوں
کی عالی دماغی اور بیدار مغزی اور فنِ اصول قانون کی آگاہی سے نہایت
تعجب اور حیرت ہوتی ہے کہ ایسے قدیم زمانہ میں کہ جب وہ مصنف موجود تھے
مسلمانوں نے اس علم میں کس قدر بلند پایہ ترقی حاصل کی تھی۔ مثلاً ہدایہ و اشباہ
والنظائر فی الفقہ کے دیکھنے سے اُن کے مصنفوں کی عظمت ہر شخص کے دل
میں بیٹھے گی کہ جو موجودہ انگریزی جوریسپروڈنس سے آگاہ ہے۔

پس اے حضرات۔ اُن لوگوں کی جو کہ اپنے علوم دینی کی اور جملہ معاملات
اسلامی کی اشاعت اور بقا کی کوشش کر رہے ہیں اُن کی سعی نہایت موجبِ تحسین

ہے کہ درحقیقت وہ ہماری قوم کی ایک حیثیتِ مقدم کی پائداری اور استواری کی فکر میں ہیں۔ اور نیز وہ طالب علم جو اپنی ہمتوری اور عالی ظرفی سے اپنی عمر ایسی کتابوں کے علوم سیکھنے میں صرف کرتے ہیں کہ جن کے جاننے سے اُن کو کوئی دنیوی نعم البدل ملنے کی توقع نہیں ہے نہایت قابلِ آفریں ہیں اور فی الواقع اُن کا قوم پر نہایت احسان ہے۔

اے حضرات۔ قومی ترقی کرنے کا اول قدم یہ ہے کہ وہ قوم خود اپنے پس ماندہ ہونے کی معترف ہو اور دوسرا قدم یہ ہے کہ اپنی پس ماندگی اور خستہ حالی کے رفع کرنے کی تدابیر سوچے اور تیسرا قدم یہ ہے کہ تدابیر مجوزہ پر عمل کرے۔ انجمن ندوۃ العلما اس راہ پر ہمتوری سے چل رہی ہے اور خدا سے امید ہے کہ اُس کی کوششیں علوم اسلامیہ کی بقا اور اشاعت میں کامیاب ہونگی۔ ہم ممبران اِس کانفرنس کے گو زیادہ تر کوششیں اشاعتِ علوم انگریزی پر صرف کر رہے ہیں۔ ایسے تنگ دل نہیں ہیں کہ احاطۂ اسلام کو تنگ کریں یا یہ کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ دینی علوم کی مساعدت کرتے ہیں اُن کے ساتھ ہمدردی نہ کریں۔ قوم اسلام کی بہتری اور فرخندہ حالی دینی اور دنیوی دونوں قسم کی ترقی پر منحصر ہے اور اس لیے مقاصد ندوۃ العلما اور وہ مقاصد جو کہ اس کانفرنس کے ہیں ان دونوں کے باہم کوئی تناقض نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کے ممد اور معاون ہیں۔

لہذا مجھکو پوری توقع ہے کہ آپ اس رزولیوشن کو باتفاق رائے دلی خوشی کے ساتھ پاس کریں گے "

سید محمود کو اُردو کی وسعت اور اُس کے ساتھ غیر انگریزی داں مسلمانان ہند کی علمی معلومات کے اضافہ کا بھی خاص خیال تھا۔ اُنہوں نے ۱۸۹۵ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ شاہجہاں پور میں بھی ایک رزولیوشن پیش کیا تھا کہ

"بنظر اس امر کے کہ انگریزی تعلیم کی کتنی ہی اشاعت ہو جائے تاہم سب سے بڑا حصہ مسلمانوں کا اس زبان سے لازمی طور پر نا آگاہ رہے گا اس لیے ہر ایک انگریزی داں مسلمان کا جو کافی قابلیت رکھتا ہو یہ فرض اخلاقی و قومی ہے کہ کم سے کم ایک کتاب اپنے مذاق کے موافق انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کرے یا ایسی کتاب تالیف کرے کہ جس میں وہ مفید علمی مضامین ہوں جو انگریزی کتابوں سے ماخوذ کیے گئے ہوں اور مسلمانوں میں یورپین علوم کی آگاہی پھیلانے کے لیے مفید ہوں "

اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ملکوں میں سفر اور آمد و رفت کے ذریعے کیسے ہی کثرت سے ہوں لیکن کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک کی

زبان کو دوسرے ملک کے باشندے ایسا ہی جانتے ہوں جیسا کہ وہ اپنی
مادری زبان کو جانتے ہیں۔ اس وقت انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان
میں آئے ہوئے کم سے کم سوا سو برس ہوئے اور اُس وقت سے اب تک
برابر ہندوستانیوں سے ارتباط رہا اس کے علاوہ تیس چالیس برس سے
انگریزی دانی ذریعہ حصول معاش و تجارت بھی ہے مگر یہ نہیں ہوا کہ انگریزی زبان
بجائے ہندوستانی زبان کے بولی جانے لگی ہو اور ہر شخص اپنے گھر بار میں
جورو بچوں سے انگریزی بولنے لگا ہو۔ اپنے یہاں کی تقریبوں میں انگریزی
زبان استعمال کرتا ہو اور اُردو بولنا قطعاً بھول گیا ہو۔ میرے خیال میں
یہ بات قوتِ بشری سے باہر ہے کہ انسان جس ملک میں پیدا ہوا ہو اور
پرورش پائی ہو وہ اپنی زبان مادری کو جو اُس ملک میں جاری ہو بالکل ترک
کردے اور وہ زبان جو ذریعہ حصول معاش ہو اُس کی زبان ہو جاوے۔
اس لیے ضرور ہے کہ جو شخص انگریزی زبان لکھ پڑھ، سمجھ سکتا ہے اور اُن
علوم و فنون سے واقف ہے جو یورپ کے ملک میں جاری ہیں اور جو
ابھی تک اُردو میں ترجمہ نہیں ہوئے اپنی قوم اور ملک کے فائدے کے
لیے علمی مضامین کا ترجمہ کرکے ملک اور قوم کے سامنے پیش کرے۔

میری غرض یہ ہے کہ اگر مسلمان طالب علم جو ذی استعداد ہوتے ہیں اور ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور علاوہ زبان انگریزی کے اپنی زبان اردو پر بھی مقدرت رکھتے ہیں اُن کو ترغیب دی جائے کہ وہ ایسی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کریں جو اس وقت تک صرف انگریزی زبان ہی میں لکھی گئی ہیں اور اپنی مدت العمر میں ایک کتاب اپنے مذاق کے مطابق ضرور تصنیف و تالیف کریں۔ اگر ایسا ہوا تو میرا خیال ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہمارے ہاں ایک وسیع اور مفید لٹریچر تیار ہو جاوے گا۔ جس سے انگریزی دانوں کے علاوہ اور لوگ بھی جو انگریزی سے ناواقف ہیں فائدہ اُٹھائیں گے۔"

لیکن یہ صرف پلیٹ فارم کا ہی خیال نہ تھا بلکہ فاضل محرک نے خود اس پر عمل بھی کیا تھا۔ اُنھوں نے اُردو میں قانون شہادت پر ایک مفصل شرح لکھی جس سے آج تک ملک مستفید ہو رہا ہے۔ اور عموماً ہندوستانی ریاستوں کی عدالتوں میں وکلا اس شرح سے استفادہ کرتے ہیں۔

علاوہ بریں اُنھوں نے مسبوق الذکر جو دو عالمانہ لیکچر تیار کیے وہ بھی اُردو میں ہیں اور اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر وہ انگریزی میں تیار کرتے تو اُردو کے مقابلے میں کم محنت ہوتی اور کم وقت صرف ہوتا اور پھر اس زمانہ میں

جبکہ ان کو شب و روز انگریزی میں اہم مقدمات کے بڑے بڑے فیصلے لکھنے کی مشق اور عادت تھی بلا شبہ ان دو لیکچروں نے اُردو زبان میں ایک نہایت نادر تعلیمی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اسی جلسہ میں اُنہوں نے مدرسۃ العلوم کے تاریخی حالات اور مسلمانوں کی کوششوں کے نتائج پر بھی ایک محققانہ و عالمانہ لیکچر دیا اور اس میں بھی علم الاعداد کی رو سے قوم کی تعلیمی حالت کا پورا پورا نقشہ کھینچا تھا۔

غرض حج سے واپسی کے بعد اُنہوں نے کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کر کے قومی تعلیم کی تجاویز میں سرگرمی و دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی تقریروں اور اپنے خیالات سے گراں قدر فوائد پہنچائے۔

(۵)

سید محمود کو اگرچہ سیاسی مسائل کے متعلق پبلک طور پر اظہارِ خیالات کا موقع نہیں ملا، اور اُنہوں نے نہ تو کبھی کوئی پولیٹیکل مضمون لکھا اور نہ کوئی سیاسی تقریر کی جس سے اُن کے سیاسی عقائد و خیالات معلوم ہوتے البتہ ۱۸۹۶ء میں محمدن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن[1] کی درخواست پر اُنہوں نے مسٹر تھیوڈر بیک پرنسپل محمدن کالج کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے لیجسلیٹو کونسل اور میونسپلٹیوں وغیرہ

---

[1] مسلمانوں کی یہ پہلی سیاسی ایسوسی ایشن تھی جو سر سید نے ۱۸۹۳ء میں قائم کی۔

میں انتخاب پر ایک مبسوط یادداشت ضرور تحریر کی تھی جس میں ہندو نیشنل کانگرس کے کامیاب مطالبۂ انتخاب اور مسلمانوں کی ناکام مخالفت کا تذکرہ کر کے رائے دی ہے کہ "اب مسلمانوں کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ وہ موجودہ لیجیسلیٹو کونسل کے قواعد میں اس قسم کا تغیر و تبدل کرا دیں جس سے ان کے ہم مذہب ممبروں کی کافی تعداد کو کونسل میں شریک ہونے کا موقع ملے" پھر اکثریت اور اقلیت پر کافی بحث کر کے اس ضرورت کو ظاہر کیا ہے کہ: "دو جگہ مسلمانوں کو ملنی چاہئیں اور دو ہندوؤں کو یہ بات بالکل واجبی معلوم ہوتی ہے اور یہ انصاف ان دونوں جماعتوں کے لیے جن میں سے ایک کا پولیٹکل درجہ بوجہ کثرت آبادی کے اور دوسری کا بہ باعث تاریخی امتیاز کے مساوی کہا جا سکتا ہے۔" اس کے بعد جداگانہ طریقہ انتخاب پر اور اس کی ضرورت و اہمیت پر بحث ہے۔ اور پھر منیوسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمان ممبروں کے لیے نشستوں کے مخصوص کرنے پر زور دیا ہے اور دکھایا ہے کہ اس وقت مسلمان کس طرح محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں دونوں قوموں کے توازن قائم رکھنے کے متعلق بھی تجاویز پیش کیں غرض یہ مضمون اس زمانہ کے ہی لحاظ سے نہیں آج کے زمانہ میں بھی جبکہ کونسلوں کے نظام میں متعدد تبدیلیاں اور متعدد مرتبہ اصلاحیں ہو چکی ہیں اور مسلمانوں کی صرف سیاسی انجمن

مسلم لیگ ہی عالم وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ ہندوستان کی عظیم الشان سیاسی مجلس نیشنل کانگرس میں بھی مسلمانوں نے اثر واقتدار حاصل کر لیا ہے، خاص طور پر غور کے قابل ہے اس کے علاوہ سیاسی معاملات میں سید محمود کی کوئی اور تجویز نہیں پائی جاتی لیکن ان کے بعض ساتھیوں اور دوستوں کا خیال ہے کہ وہ سیاسی خیالات میں اس وقت کے مسلمانوں سے آگے اور تیز تھے اور ان کی اُفتاد مزاج بھی یہی بات باور کراتی ہے۔

ان کے ایک قابل شاگرد ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ نے جنھوں نے محمدن کالج میں تعلیم پائی تھی اور سرسید کے ساتھ جن کے خاندانی تعلقات بھی تھے اور عرصہ تک لکھنؤ میں سید محمود کے پاس بطور معاون رہ چکے ہیں ان کے انتقال کے بعد جو مضمون لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "مسٹر محمود کی ہمدردی عام تھی اور وہ ترقی کے سچے خواہاں تھے ہندوؤں میں بھی ان کے دوست اتنی کثرت سے تھے جتنے مسلمانوں میں انڈین نیشنل کانگرس کے متعلق بھی ان کے وہ خوف آمیز خیالات نہ تھے جو اس زمانہ میں اکثر ان کے ہم مذہبوں کے تھے اور میرا خیال ہے کہ اگر سر سُریندر ناتھ بنرجی اور مسٹر ایم۔ اے بوس ان سے مل کر خواہش کرتے تو وہ اس قومی جماعت کی صدارت کے لیے

بھی آمادہ ہو سکتے تھے۔ مسٹر محمود پالٹیکس میں ایک دوررس نظر کے انسان تھے اور ان میں مادر وطن کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ ان اکثر خود ستا مدبّروں سے زیادہ پایا جاتا تھا .... اس میں شک نہیں کہ وہ ہندو مسلمانوں میں کامل محبت اور اتحاد کو دیکھنے کے آرزومند تھے وہ اکثر مجھسے بطور تفنن کہا کرتے تھے کہ تم ہندوؤں میں برہمن ہو اور میں مسلمانوں میں سیّد ہوں۔ آؤ ہم دونوں دوستی اور اتحاد کا ہاتھ ملائیں۔ ایک زمانہ میں جب مسٹر بیک کی تحریک پر علیگڑھ (محمدن کالج) سے سنسکرت کی چیر ہٹا دی گئی تو مسٹر محمود ہی کی کوشش سے پھر وہ قائم ہوئی تھی۔"

سیّد محمود کو صوبہ کی کونسل میں بھی ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے ممبر نامزد کیا تھا اور وہ اس کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے لیکن اُنہوں نے کوئی خاص کام نہیں کیا کیونکہ اس زمانہ میں یوریپین سوسائٹی کے اس تباہ کُن اثر سے جو بالآخر عقل و خرد کو تباہ کر دیتا ہے، اُن کے مزاج کی حالت خراب ہو چکی تھی۔

(۶)

سیّد محمود زیادہ دن تک علیگڑھ میں نہ رہ سکے اور جب کہ ایک مرتبہ وہ صوبہ کی کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے الٰہ آباد آئے تو اُنہوں نے لکھنؤ میں پریکٹس کا بندوبست کر کیا اور ان کی زندگی کا آخری باب اودھ کے

ایک قانون پیشہ مقنن کی حیثیت سے شروع ہوا- اور گو ان کا محنتانہ بہت زیادہ ہوتا تھا لیکن ان کے پاس کام برابر آتا تھا کیونکہ عامتاً اِن کی قانونی قابلیت پر سب کو زبردست اعتماد تھا مگر چند روز کے بعد جب ان کی عادات کا تغیر ناقابل برداشت ہوگیا تو کام میں بھی کمی ہو گئی-

۱۸۹۸ء میں سرسید کی رحلت کا حادثہ پیش آیا- اس زمانہ میں سید محمود علی گڑھ میں ہی تھے وہ طے شدہ مسئلہ کی بنا پر اپنے باپ کے جانشین ہو گئے لیکن قومی بدقسمتی کیا کہ اُس کیمیا میں اثر نہ رہا تھا کہ اُس آفتابِ تاباں کی روشنی زائل ہو چکی تھی ایک ہی سال میں ٹرسٹیوں نے ان کو کالج کی بہتری کے لحاظ سے آنریری سکرٹری کے عہدہ سے سبکدوش کرنا مناسب تصور کیا-

اسی زمانہ میں نواب محسن الملک نے ایک مضمون کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا ہم بھی اس تذکرہ میں اسی کو نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں- انہوں نے لکھا تھا:-

"سارے ہندوستان میں ایک سید محمود ہی تھے جو درحقیقت اپنے معزز اور نامور باپ کے سچے اور اصلی قائم مقام ہو سکتے تھے اور جو اپنے بزرگ والد کے تمام کاموں کو نہایت خوبی سے پورا کر سکتے تھے- کاش وہ تندرست رہتے- اور ان کی طبیعت بھی اپنے باپ کی طرح مائل الی القوم ہوتی- اور مدرستہ العلوم کا کام

جیسا کہ ابتدا میں انہوں نے کیا تھا اور جن کی عالی دماغی اور عالمانہ قابلیت سے مرحوم سرسید کو بہت مدد ملی تھی وہ اب بھی کر سکتے اور علالتِ مزاج اُس کی مانع نہ ہوتی تو آج قوم کے اقبال کا ستارہ آسمان پر ہوتا۔ اور سرسید کی وفات کا اثر کسی پر محسوس نہ ہوتا۔ اور علی گڑھ کالج کے یونیورسٹی ہو جانے میں کسی کو شک و شبہہ نہ رہتا۔ کیا ان کے ساتھ کام کرنے میں کسی کو عار ہوتا؟ اُن کے مقابلہ پر کوئی کھڑا ہو سکتا یا اُن کے سامنے قوم کسی کو نظر اُٹھا کر بھی دیکھتی؟ غالباً بلکہ یقیناً سارا ہندوستان ان کے ساتھ ہوتا۔ اور سب سے اول میں اُن کا غاشیہ اپنے دوش پر لیکر اُن کے پیچھے پیچھے چلتا۔ مگر "امر للانسان ما تمنّٰی" مسلمانوں کی ایسی قسمت کہاں تھی کہ یہ دن اُن کو نصیب ہوتا۔ اور ہماری یہ آرزو پوری ہوتی۔ افسوس کہ ہماری دعا نے اثر کیا نہ ہماری گریۂ وزاری نے کچھ فائدہ بخشا۔

باطالعِ بداتنکِ شب وآہِ سحر، ہیچ   درزاریِ خود دلے ندیدیم اثر ہیچ
صدآہ کہ ایں نخل نیاورد ثمر ہیچ   اُمید بسے داشت دلِ غمزدہ از آہ

(۷)

اس حالت میں بھی اُنہوں نے جب کبھی طبیعت درست ہوئی تو قواعد و قوانین کالج کی اصلاح و ترتیب میں خاص توجہ کی اور ان کی توجہ سے ایک حد تک

کامیابی بھی ہوئی جس کا شکریہ ٹرسٹیوں نے اپنے سالانہ اجلاس میں ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے ادا کیا۔

وہ سکرٹری شپ سے سبکدوشی کے بعد پریسیڈنٹ اور پھر کالج کے وزیٹر کردیئے گئے تھے اور گویا اب عملاً ان کا تعلق کالج سے منقطع ہو چکا تھا وہ زیادہ تر سیتاپور میں اپنے ابنِ عم مولوی سید محمد احمد کے ساتھ رہتے تھے سیتاپور کے قیام سے ان کی طبیعت پر اچھا اثر پڑنا شروع ہوا تھا اور بالکل تندرست معلوم ہوتے تھے لیکن یہ تندرستی چراغ سحری کی روشنی تھی۔ مئی ۱۹۰۳ء کے شروع میں صرف چند روز ان کو بخار آیا اور ۸ مئی مطابق ۱۰ صفر ۱۳۲۱ ہجری کو جمعہ کے دن ۱۱ بجے ۵۴ منٹ پر انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

سیتاپور سے ان کی لاش علیگڑھ آئی اور نامور باپ کے پہلو میں نامور بیٹے کو دفن کیا گیا۔

ان کے ماتم میں کالج بند رہا اور ٹرسٹیوں نے تعزیت کا جلسہ کرکے ایصال ثواب کے لیے دعاہائے مغفرت سے یاد کیا۔

ان کی عمر سولہ دن کم ترپن برس کی تھی عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھے اگرچہ ان کی حالت سے روز بروز مایوسی ہوتی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی امید کی ایک یہ

جھلک دلوں میں موجود تھی کہ اگر اُن کی طبیعت اصلاح پر آگئی تو قوم کا نصیب بیدار ہوجائیگا مگر اس امید کا پورا ہونا مشیت ایزدی میں نہ تھا۔

سید محمود کی حالت کا انقلاب ایک شخصی واقعہ نہ تھا بلکہ اس بیسویں صدی میں مسلمانوں کی بدقسمتی کا واقعہ ہے جس کا رنج وہ اثر اس وقت تک باقی اور تازہ رہے گا جب تک کہ ان کا نعم البدل قوم کو نہ ملے گا۔

(۸)

سید محمود میں وہ تمام اعلیٰ صفات موجود تھیں جو ان کے اعلیٰ خاندان کا ورثہ اور ان کی قدیم مشرقی تعلیم کا نتیجہ کہی جاسکتی ہیں۔

وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ نہایت اخلاص و اخلاق اور بے تکلفی سے ملتے تھے ان میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا اور قدیم تعلقات کا خواہ وہ مسلمانوں سے ہوں یا ہندوؤں سے بے انتہا پاس و لحاظ کرتے تھے۔

وہ سیر چشم فیاض اور عالی حوصلہ تھے ان کا دل اسی قدر وسیع رقیق اور نرم تھا جتنا کہ ان کی طبیعت ذہین اور دماغ تیز تھا کوئی سائل ان کے پاس ایسا نہیں جاتا تھا جس کو وہ اسکی توقع سے زیادہ نہ دے کر واپس کرتے ہوں ان کے خیال میں روپیہ پیدا کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صرف کیا جائے اسی لیے

ان کی جیک مبک وقفِ عام تھی۔ اُنہوں نے کالج کو بھی ہمیشہ اور ہر موقع پر مالی امدادیں دیں۔ اور شرح قانونِ شہادت کا حق تصنیف بھی کالج کو دیدیا جس کے متعدد ایڈیشنوں سے کالج نے ہزاروں روپیہ کا فائدہ حاصل کیا۔

وہ خیالات میں بہت پختہ تھے، چاپلوسی، تملق اور منافقت سے ان کو کلی نفرت تھی اور اس کو دیکھ کر صبر کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔

وہ خوش مزاج تھے اور ان سے ہر قسم اور ہر طبیعت کے آدمی کو مل کر خوشی ہوتی تھی اگرچہ آخر زمانہ میں ملاقاتیوں کے لیے کچھ لُطفِ ملاقات باقی نہ رہا تھا۔ تاہم ناممکن تھا کہ کوئی شخص علیگڑھ جائے اور چند لمحے ان کے پاس نہ گذارے خوش مزاجی وخوش مذاقی اور دوستوں کے ساتھ ہنسی اور قہقہے ان کی خصوصیت تھی۔

اُردو کے وہ ایک کامل ادیب تھے اور مشکل ترین مضمون کو نہایت سلیس اور فصیح پیرایہ میں ادا کرنے کی پوری قدرت حاصل تھی وہ کبھی کبھی تہذیب الاخلاق میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتے تھے۔ ان کے تین مضمون شدت اتقا" "دوستی کا برتاؤ" "یونیورسٹی کیمرج" جلد چہارم میں یک جائی طور پر شائع ہو چکے ہیں اور ان کے مطالعہ سے ادبی شان کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے ۔نظم کے بھی بڑے شائق تھے اور اکثر بے تکلف صحبتوں میں یا تنہائی کے وقت شعر

پڑھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریروں اور تحریروں میں بھی بہ کثرت موقع محل کے
لحاظ سے اشعار ہوا کرتے تھے فارسی لٹریچر سے خاص ذوق تھا ججی کے زمانہ میں
مرزا سنجر طہرانی جو اس دور میں ایک کامل الفن اور زبردست شاعر تھے اور
جن کے ساتھ سرسید کو بھی خاص اُنس تھا اکثر ان کے پاس جاتے اور گھنٹوں
شاعری کا شغلہ رہتا تھا اور سید محمود ان کی ہمیشہ مالی امدادیں کرتے رہتے تھے۔
وہ اگرچہ مشقِ سخن نہیں کرتے تھے لیکن کبھی کبھی تفنّنِ طبع کے لیے یا کسی موقع پر کچھ
برجستہ فارسی اشعار کہہ لیتے تھے چنانچہ ۱۸۹۰ء میں جب نواب محسن الملک پہلی مرتبہ
علی گڑھ میں کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور ایک رزولیوشن کی تائید کرنی
چاہی ہی تو ان کی تقریر سے پہلے سید محمود نے نہایت پرجوش لہجہ میں یہ غزل پڑھی ۵

ندارم آرزو از دل کہ از دل آرزو دارم — کہ رازِ خویش پنہانی بہ پیشِ خویشتن آرم
ہمہ آں سہل و آساں ہر چہ تدبیرش ہمی آری — دلم ایں خواہد و آں خواہد اما من چنیں خواہم
می خواہم کہ چیزے خوب گویم ہر ہندستاں — کہ ہندستاں نژادِ ہستیم ہند واست جانانم
نمی خواہم کہ از گفتارِ خود آتش برافروزم — کہ ہر چیزے کہ در دل آید از قرآں می خوانم
چو قیدِ قافیہ بندی نہ باشد بر زبانِ من — بدل ہرگز نمی آید کہ ایں فن را نمی دانم
مرا یارسیت شیریں کار و می نازم کہ در گیتی — ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

الا اے مہدی ہندی کہ مشغولِ دگر گشتی　　مرا ہم باز پرس آخر کہ عشقت ہست درمانم

دریغ از گردشِ گردوں کہ دور افتادہ ایم از تو　　کہ ہستی انتخاب از زمرۂ احباب واخوانم

ازاں گفتم من اے محمود ایں اشعارِ رنگیں را

کہ مخدومی اخی مہدی علی شد جان وایمانم

مسلمانوں میں عربی و فارسی کی تعلیم کے زندہ رہنے کے وہ زبردست حامی تھے محمدن کالج کے ساتھ اورینٹل کالج اُن کی کوشش سے قائم ہوا تھا اور جب طلبہ کی کمی تعداد کی وجہ سے اورینٹل کالج توڑا گیا تو اُنہوں نے سخت مخالفت کی تھی اُن کی خواہش تھی کہ جس طرح ممکن ہو اورینٹل کالج کو دوبارہ قائم کیا جاوے۔

الہ آباد یونیورسٹی جب سے قائم ہوئی ہمیشہ یونیورسٹی کے ہندو فیلوز کی یہ کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح ہو فارسی زبان کی تعلیم کے رجحان کو روکا جاوے چنانچہ ایک دفعہ یہ تجویز ہوئی کہ فارسی کے ساتھ عربی کو شامل کر دیا جاوے کیونکہ سنسکرت مشکل ہے اگر فارسی کے ساتھ عربی کو شامل کر دیا جاویگا تو سنسکرت اور فارسی کا توازن برابر ہو جائیگا مقصد یہ تھا کہ ہندو فارسی پڑھنا چھوڑیں اور مسلمانوں کو فارسی کی وجہ سے امتحان میں کامیابی دشوار ہو جاوے۔ سید محمود یونیورسٹی کے فیلو تھے اُنہوں نے نہایت سختی سے اس تجویز کی مخالفت کر کے تحریک کو ناکامیاب کیا۔

اس کے بعد ایک دفعہ یہ تجویز پیش کی گئی کہ فارسی کی نظم اخلاق کے لیے نہایت مضر ہے۔ اس کی شاعری عاشقانہ ہے۔ چنانچہ یورپین ممبر بھی متفق ہو گئے۔ سید محمود نے یونیورسٹی کے ہر ایک کلاس کی کورس کی انگریزی کتابوں سے اقتباس کر کے ایک دلچسپ بحث تیار کی اور یہ دکھایا کہ انگریزی نظمیں جو انگریزی کورس کی کتابوں میں ہیں بہ مقابلہ فارسی نظموں کے زیادہ مخرّب اخلاق ہیں۔

کانفرنس کے مقاصد میں فرامین شاہی اور قلمی کتابوں کا جمع کرنا بھی سید محمود کے دماغ کا نتیجہ ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ سید محمود کے اس خیال کو عملی صورت میں لانے کا شرف اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو حاصل ہوا جہاں عربی و فارسی کی نادر و نایاب کتابوں اور فرامین شاہی کا نایاب ذخیرہ کافی تعداد میں جمع ہو گیا ہے۔

ان کا رجحان زیادہ تر تصوف کی طرف تھا اور ایسے ہی اشعار سے زیادہ ذوق تھا ہندوستان کی السنۂ قدیم کے ساتھ بھی پوری دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے الہ آباد کی کانفرنس میں اس امر کی تحقیقات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں نے اصلی السنۂ ہندوستانی پر کہاں تک قدرت حاصل کی تھی مذہب میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علما کی عزت کرتے تھے علوم اسلامیہ کا احترام و وقار ان کے دل میں تھا جیسا کہ ندوۃ العلما کی تائیدی تقریر میں انھوں نے خود ظاہر کیا ہے۔" وہ کالج کے طلبا کو اعمال مذہب کا پابند

دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ اُنھوں نے اور مولانا شبلی نے مل کر ایک مجلس "تحیۃ الصلوٰۃ" قائم کی تھی۔ وہ عجیب پر لطف منظر تھا جبکہ اُنھوں نے کالج کی مسجد کی بنیاد قائم ہوتے وقت اپنے ہاتھ میں پھاوڑہ لیکر زمین کھودی تھی۔ ان کے پاس کتب دینیات کا بڑا ذخیرہ تھا جو اُنھوں نے کالج کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب یہ کتابیں لٹن لائبریری میں ہیں۔ ان کتابوں کے لیے سرسید کے مزار کے قریب ایک وسیع حجرہ بھی ہے۔ جس کے دروازہ پر بخط طغرا "کتب خانہ دینیات سید محمود" لکھا ہوا ہے۔ سرسید کے مذہبی عقائد سے اگرچہ ان کا اختلاف نہیں دیکھا گیا لیکن خود سرسید نے نواب محسن الملک کے نام کے خط میں ایک واقعہ کو جبکہ وہ لندن میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اس طرح لکھا ہے کہ "اس کو مذہب اسلام اور اس کی خوبیوں اور اس کے مسائل کی سچائی پر ایسا استقلال اور یقین کامل ہو گیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے اس کتاب میں جہاں ذکر حجرِ اسود لکھا ہے وہاں یہ بات لکھی ہے کہ جو حدیثیں نسبت حجرِ اسود کی وارد ہیں کہ وہ بہشت کا پتھر ہے اور چنیں و چناں وہ ضعیف ہیں سند کامل نہیں رکھتیں۔ وہ دو گھنٹہ تک بیوقوفی سے لڑا کہ نہیں یہی سچ ہے اور اسی پر مجھے کامل یقین ہے۔ میں نے کہا کہ بابا تو اپنا یقین اپنے ساتھ رکھ تو میری رائے میں کیوں دخل کرتا ہے۔ کہا کہ نہیں جو مجھے یقین دل سے ہے وہی سچ ہے۔ غرضکہ ایسی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے

جبکہ میں نے اس کی تحقیقات بیان اور اصلیت لکھی اور بیان کیا کہ وہ کیا چیز ہے اور اصلیت اس کی کیا ہے تو اس سب کو پسند کیا مگر کہا کہ وہ بھی سچ ہے اور یہ بھی لکھدو کہ حقیقت میں فرشتے بہشت سے لے کر آئے تھے۔ تماشا یہ ہوا کہ جب نوبت تحریر اس اعتراض کی پہنچی کہ حجرِ اسود کو بوسہ دینا اور کعبہ کے گرد پھرنا کیوں بُت پرستی نہیں اور مہادیو کے گرد پھرنا اور ڈنڈوت کرنا کیوں بُت پرستی ہے۔ چنانچہ عیسائیوں کا اعتراض ہے کہ آنحضرت صلعم کامل طرح سے بُت پرستی موقوف نہ کرسکے تو جھٹ پٹ بول اُٹھا کہ "خدا کا حکم" میں نے کہا کہ ہندو بھی کہتے ہیں کہ خدا کا حکم جب نہایت دِق ہوا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو جو جواب میں نے لکھا ہے وہ سنایا اُس کو سُن کر اس کا خون بڑھ گیا کہ اسلام پر سے یہ اعتراض خوب اُٹھایا گیا ہے ۔"

چونکہ وہ نہایت غیور طبیعت رکھتے تھے اسی بنا پر اُنہوں نے کالج میں ایک سادات منزل تعمیر کرنے کی تجویز کی تھی اور اس کے لیے فنڈ بھی قائم کیا تھا جس میں وہی لوگ چندہ دینے کے مجاز تھے جو بنی فاطمہ ہوں اور اس بورڈنگ ہاؤس سے جو آمدنی ہو وہ بھی انھیں سادات کے بچوں پر صرف کرنی قرار پائی تھی۔ افسوس ہے کہ اس فنڈ کا آغاز تو ہوگیا اور کچھ چندہ بھی جمع ہوا اور بیگم صاحبہ مرشد آباد نے پورا صرف دینے کا وعدہ بھی فرمایا لیکن اُس عمارت کی بنیاد بھی قائم نہ ہوسکی۔

ان کی قانونی قابلیتوں کا تذکرہ اس قدر وسیع ہے کہ ان چند اوراق میں اس کی گنجائش نہیں البتہ الہ آباد کے ایک زبردست مقنن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کے ایک مضمون سے جو اُنھوں نے سید محمود کے انتقال کے بعد لکھا تھا اور جس میں ان کو "بحیثیت جج" دکھلایا تھا ذیل کے چند فقرے بطور اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

"پبلک مسٹر محمود کو اپنے زمانہ کے بہترین جج کی حیثیت سے جانتی ہے اور میں ان کو بحیثیت جج کے اس لیے نہیں لکھتا ہوں کہ ان کی زندگی کسی اور پہلو سے قابل دلچسپی نہیں تھی بخلاف اس کے جو اشخاص کہ ان سے اچھی طرح واقف تھے ان خوبیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ان کی دل سے عزت کرتے تھے ان کی عدالتانہ تقریروں، ان کی زبردست عقل سلیم اور آزاد خیالی کا سبب ان کی وہ عام تربیت تھی جس نے ان کو سوسائٹی میں چمکایا تھا۔

اُنھوں نے انتہائی دیانت داری و بلند حوصلگی سے (جس میں مظلوموں اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی تھی) کام کیا اور جس کے سبب سے بحیثیت جج کے ان کو وقار حاصل ہوا پبلک کا ان پر عام اعتماد تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ عام لوگوں کا اور اہلِ غرض کا یہ خیال تھا کہ وہ ہمیشہ انصاف کی (اور کم از کم اس قدر انصاف کی جہاں تک قانون میں گنجائش ہے) کوشش کرتے ہیں اور اسی انصاف کے خیال

سے اُنہوں نے اکثر قانون کی خامیوں اور کمزوریوں کو نظرانداز کر کے آگے قدم بڑھایا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ قانون کا دائرہ محدود ہے اور اس سے تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا لیکن وہ پروٹسٹ کیے بغیر نہ رہ سکے وہ انصاف کو کوئی ہیبت ناک چیز یا فریب کا آلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُنہوں نے ہمیشہ قانون کو "تاریکی" میں "روشنی" خیال کیا۔ انگریزی قوانین کے استعمال میں ہمیشہ ان کی نظر اس طرف رہتی تھی کہ واضعانِ قانون کا منشا کیا ہے اور کس خرابی کو دور کرنے کے لیے وہ قانون بنایا گیا ہے۔ "تکمیل" ان کا نصب العین تھا اور یہی لفظ ایک قابل دماغ کا نصب العین ہوتا ہے قدرت نے ان کو ایک عظیم الشان دماغ عطا کیا تھا اور اس کی باقی تکمیل اُنہوں نے خود کی تھی"۔

اُن کی زندگی ہماری قوم کے نوجوانوں کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے اور اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو وہ آخری باب بھی جو قومی بدنصیبی کی ایک شرح ہے عاقل انسانوں کے لیے صحیفۂ عبرت ہے اور اگرچہ ان کی زندگی کے کارنامے بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جس قدر ہیں وہ عدیم المثال اور لاثانی ہیں۔ غرض وہ عجیب خوبی کا انسان تھا جس کی زندگی بصیرت افروز اور عبرت انگیز ہے۔ ایسے جوہرِ قابل صدیوں میں کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔

ازمولانا ظفر علی خاں بی۔ اے

سر سید مرحوم کا وہ نورِ نظر تھا — اس سے بھی سوا ہند کی نظروں میں مگر تھا
تھا قوم حزیں کے لیے سرمایۂ نازش — ازبسکہ وہ گنجینۂ صد فضل و ہنر تھا
پہنائے ہوئے اُس کے معانی کے دقائق — مخزن تھا فضائل کا معارف کا وہ گھر تھا
قانون کے اسرار و غوامض کو خصوصاً — اُس کی ہمہ دانی کے مقابل نہ مفر تھا
دل اور دماغ اُس کے تھی مافوق حوالی — اپنوں میں تو موجود تھا مثل اُس کا اگر تھا
بیگانے تھے اپنوں سے سوا اُس کے ثناخواں — اس درجہ قوی اُس کے فضائل کا اثر تھا
عظمت کبھی محسوس نہ اپنی ہوئی اُس کو — باطن میں فرشتہ تھا وہ ظاہر میں بشر تھا
میراث میں نانا کی غنا اُس کو ملی تھی — ہمسنگ خزف اس کے لیے نقرہ و زر تھا

محمود کے مرنے کی ہے دشوار تلافی
ہے صبر کا یہ صدمۂ جانکاہ منافی

مرحوم کو دے خلد میں خالق اکبر — نعم البدلِ سید محمود عطا کر

محمد امین زبیری مارہروی

۶۹۳۴

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

علیگڈہ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور مشہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھہ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ دارالاقامہ میں متعدد قابل استاد اور علما، بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُن کے ساتھہ رہتے ہیں۔ مفصل حالات کے لئے دستور العمل طلب فرمائیے۔

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)
ہیڈ ماسٹر